بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے "صدق جدید" لکھنؤ میں اس برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں آئے دن ایک دوسرے کے خلاف جو مناقشت و منافرت کے افسوس ناک مظاہرے ہوتے رہتے ہیں، ان پر اپنے دلی کرب اور انتہائی ذہنی اذیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:- "جس دین کی بنیاد ہی عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت، عقیدۂ جزا و سزا اور تقدیس قرآن اور استقبال قبلہ کی سی مشترک و مضبوط بنیادوں پر ہو، وہ تو آج اس تشتت، انتشار، پراگندگی میں مبتلا ہو (اور "آج" کی قید کیوں صدیوں سے ملت اس میں مبتلا چلی آرہی ہو) اور دوسری ملتیں جن کے اندر اشتراک کی بنیادیں کہیں اس کی آدھی چوتھائی بھی نہیں، وہ آج اپنے کو اس درجہ منظم متحد بنانے میں لگی رہیں۔"

مولانا عبدالماجد صاحب نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی باہمی فرقہ وارانہ آویزش کا ذکر ہند کے ایک صوبہ کیرالا کے اس واقعہ سے متاثر ہو کر کیا ہے، جہاں کے شروع دسمبر میں سارے کلیساؤں یعنی مختلف مسیحی فرقوں نے بمبئی میں جمع ہو کر اس پر غور و فکر کیا کہ آپس میں اتحاد زیادہ سے زیادہ کیوں کر پیدا کیا جائے اور مسیحیوں کے باہمی مناقشہ و مخاصمہ کو کم سے کم حد پر کیوں کر لایا جائے۔ چنانچہ اس پر ٹری وندرم کے بڑے پادری اور دوسرے بڑے اور چھوٹے پادریوں نے تقریریں کیں اور تجویزیں پیش اور پاس ہوئیں۔

مسیحی کلیساؤں کی آپس میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا کرنے کی یہ کوشش صرف کیرالا تک محدود نہیں۔ اس سے بہت اوپر سطح پر بھی کچھ عرصے سے یہ کوششیں جاری ہیں۔ مسیحی دنیا یا زیادہ صحیح الفاظ میں مسیحی یورپ کے تین بڑے کلیسا (چرچ) ہیں۔ کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور مشرقی یونانی کلیسا۔ گو ان کے ہاں صدیوں سے بنیادی اعتقادات میں اختلافات چلے آتے ہیں اور ان کے ماننے والوں میں بڑی خون ریز جنگیں بھی ہوئیں اور جب قابو

چلاتو ایک فرقے والوں نے دوسرے فرقے والوں کو زندہ جلایا بھی اور عجیب عجیب طرح کی دوسری ہولناک سزائیں بھی دیں، لیکن اب یہ کلیسے ماضی کے ان خونیں اوراق کو تاریخ کے حوالے کرکے سب مسیحیوں کو ایک مشترک اساس پر متحد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسیحی اخبارات اس اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ ہر فرقے کے مسیحی اہل قلم اور مفکر اس کی ضرورت بتاتے ہیں، خود پادریوں کا ایک گروہ اس کی حمایت کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں مسیحی تاریخ میں ایک انوکھا واقعہ ہوا۔ برطانیہ کے پروٹسٹنٹ کلیسا کے لاٹ پادری خود بنفس نفیس روما پہنچے اور کیتھولک کلیسا کے پوپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک اطلاع ہے کہ یونانی کلیسا کے لاٹ پادری نے بھی روما میں پوپ سے ملاقات کی۔

یہ سب کچھ مسیحی دنیا میں ہو رہا ہے، کیونکہ اس کے مذہبی رہنما محسوس کر رہے ہیں کہ اگر پہلے کی طرح مسیحی فرقے ایک دوسرے سے دست و گریبان رہے اور ان کی مذہبی سرگرمیوں کا دائرۂ کار صرف اعتقادی بحثوں اور اپنے مخالف فرقوں کی تفسیق اور تکفیر تک محدود رہا تو ایک طرف کمیونزم کا سیلاب اور دوسری طرف عام بداخلاقی، بے راہ روی اور لذت پرستی و مادیت طلبی کی رَو پوری مسیحیت کو بہا کر لے جائے گی۔ یہ تو بیرونی خطرہ ہے جو مسیحی کلیساؤں کو باہم متحد ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مسیحی پادریوں اور مسیحی اہلِ قلم اور مفکروں میں بھی روشن خیالی پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو وسعتوں کا سمٹنا، فاصلوں کا کم ہونا اور اس طرح قوموں اور مذہبوں کا باہم قریب ہونا اور ایک دوسرے کو جاننا ہے اور دوسرے نیا علم، نئی ثقافت اور نئی سائنس انسانی فکر کو بالکل ایک نئی راہ پر ڈال رہی ہے۔ اور مذہبی فرقہ و روایت نے جو ذہنی دیواریں انسانوں کے درمیان مستحکم کر رکھی تھیں، وہ ایک ایک کرکے ٹوٹ رہی ہیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے ۔۔۔ اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

مسیحی کلیساؤں کے باہمی اتحاد کے اس رجحان سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ عہد ماضی میں ان کے جو معتقدات تھے، اور جن کی وجہ سے ان کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں، ان کے بارے میں ان میں باہم کوئی مفاہمت ہو گئی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ان کلیساؤں کے اپنے اعتقادات علیٰ حالہٖ قائم ہیں، اور وہ ان کو اسی طرح مانتے ہیں، لیکن روزمرّہ زندگی میں اب ان نظری اعتقادات کی وہ اہمیت نہیں رہی، جو صدیوں تک پہلے تھی، اور جس نے انہیں ایک دوسرے کا سخت دشمن بنا دیا تھا۔

یہ کیسے ہوا؟ آج کلیسا کا کام محض اپنے متعلقین کے عقائد کو درست رکھنا اور انہیں عبادت کی مراسم ادا کرنے میں

مدد دینا نہیں ہے۔ کلیسے اپنے حلقے کی اجتماعی خدمت کے بھی مراکز بن گئے ہیں۔ اور پادری بنفس نفیس ان سرگرمیوں کے انچارج ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے حلقے میں کون بیمار ہے، جس کی کہ تیمار داری کی جائے۔ کون بیکار ہے کہ اسے روزگار کی ضرورت ہے، یورپ و امریکہ میں تو کلیساؤں میں نفسیاتی و اخلاقی اصلاح کے تحقیقاتی ادارے ہیں اور چونکہ پادری دینی تعلیم کے علاوہ اجتماعیات اور سماجیات کے علوم میں بھی عموماً درک رکھتے ہیں، اس لئے وہ ان اداروں کو بڑی اچھی طرح سے چلاتے ہیں اور مذہب کی مدد سے لوگوں کے لئے روحانی تسکین بہم کرتے ہیں۔

اپنے عوام کے روزمرہ کے مسائل، ان کو پیش آنے والی آئے دن کی مشکلات، ان کے دکھ درد، ان کی بیماری یہاں تک کہ ان کی نفسیاتی الجھنوں اور اخلاقی پریشانیوں سے پادریوں کے براہ راست تعلق اور ان سب میں اپنے عوام کی مدد کرنے کے رجحان نے جدید کلیسا کو حقیقت پسند بنا دیا ہے، اور اس نے تجربے سے دیکھا ہے کہ عوام کے دلوں تک پہنچنے اور انہیں مذہب کی حقیقی روح سے آشنا کرنے کا مؤثر طریقہ ان کی خدمت ہے نہ کہ اعتقادات کے باہمی اختلافات کو ہوا دے کر ان کے اندر ایک دوسرے کے خلاف منافرت پھیلانا اور اس طرح انہیں اپنے ساتھ رکھنا۔

اور یوں بھی خالص نظری بحثیں اختلاف و انتشار پیدا کرتی ہیں اور عمل۔ مثبت عمل۔ مفید عمل انسانوں کو جوڑتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے جہاں بھی ایمان یعنی نظری عقیدے پر زور دیا ہے، وہاں اس کے ساتھ ہی عمل صالح کا بھی اس ایمان کے بطور ایک جزو لاینفک کے ذکر کیا ہے۔

آج مسیحی کلیسا کو جن خطرات کا سامنا ہے، وہ اپنی اس طرح اصلاح کر کے کہاں تک ان کا مقابلہ کر سکتا ہے، یہ تو بعد کے واقعات ہی بتائیں گے، لیکن اس کی یہ اصلاحی کوششیں خود اپنی جگہ قابل تعریف ہیں اور ہمارے لئے کافی حد تک سبق آموز۔

مولانا عبدالماجد صاحب "صدق جدید" کے شذرہ میں مسلمان فرقوں میں آپس میں جس طرح سر پھٹول ہوتی رہتی ہے اور ایک فرقہ دوسرے کے خلاف قلم اور زبان کی تمام تر قوتیں جیسے صرف کرتا ہے، بڑے رنج و الم کے ساتھ، ایسے جیسا کہ ان کے قلم سے روشنائی نہیں بلکہ خون دل کے قطرے ٹپک رہے ہیں، اسے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"لکھنؤ کے شیعہ سنی مناظروں کی گونج کس کے کان میں نہیں پہنچی ہے؟ اور اکیلے لکھنؤ کی نہیں، جونپور، مرادآباد، امروہہ اور کن کن مقامات کی؟ اور تنہا مناظروں تک کیوں رہئے۔ ماتمی جلوس اور چار یاری جھنڈے، مدح صحابہ و قدح صحابہ کب بغیر خون ریزی اور چاقو زنی کے جوہر دکھائے کے ختم ہوئے ہیں۔ خود سنیوں کے ہاں

مقلدوں اور غیر مقلدوں، اہل حدیث، اہل فقہ کے معرکے کچھ کم رہے ہیں۔ حضرات بریلی اور بزرگان دیوبند کا ٹکراؤ کچھ کم ہولناک رہا ہے؟ محض حرف ضاد کے صحیح مخرج کی بحثوں نے کیا کچھ کم طول کھینچا ہے۔ شریعت کے لفظ اور شریعت کے قانون کے ناموں سے کچھ کم کیچڑ ہر فریق نے دوسرے کے مقابلے میں اچھالا ہے"

واقعہ یہ ہے کہ مولانا موصوف نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ حصول پاکستان کی جدوجہد کے دوران یہ فرقہ وارانہ مخاصمتیں کچھ دب گئی تھیں، لیکن آزادی کے بعد ایک طرف ہندوستان میں اور دوسری طرف پاکستان میں انھوں نے پھر سر اٹھایا۔ چنانچہ اس بیس سال میں ان کی شدت اور وسعت برابر بڑھتی جارہی ہے۔ یہاں پاکستان میں مسجدیں، دینی مدرسے، مذہبی رسالے اور مذہبی عوامی پلیٹ فارم سب اسی مخاصمانہ فرقہ پرستی کی لپیٹ میں آگئے ہیں اور بظاہر اس آگ کے ٹھنڈے ہونے کے کہیں آثار نظر نہیں آتے۔

یہاں پاکستان میں فرقہ وارانہ مخاصمت کی ہمہ گیر شدت اور حالات کی سنگینی و دگرگونی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ مغربی پاکستان کے محکمہ اوقاف نے بڑی مشکلات سر کر کے بہاول پور میں دینی علوم کی تعلیم کے لئے اس امید پر جامعہ اسلامیہ قائم کی کہ وہاں مختلف مکاتبِ خیال کے علماء جب مل بیٹھیں گے تو ایک متحدہ دینی نظام کی طرح پڑ سکے گی۔ اور اس وقت پورے صوبے میں خالص جماعتی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر جو تمام دینی مدارس چل رہے ہیں، اس فرقہ پرستی اور جماعتی تعصب کے اندھیرے میں۔ اگر اسے اندھیرا کہنے میں کوئی حرج نہ ہو۔ کل جماعتی تعلیم دین کی شمع روشن ہو پائے گی۔ لیکن یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس جامعہ میں بھی، جس کے مصارف کا بار حکومت کا ایک محکمہ اٹھاتا ہے، فرقہ واریت ہی آج غالب ہے اور اتحاد بین الفرق کے امکانات کم ہی ہیں۔

مولانا عبدالماجد صاحب نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ یہ ملت آج سے نہیں، صدیوں سے تشتت، انتشار اور پراگندگی میں مبتلا چلی آتی ہے۔ اور درحقیقت مسلمان قوموں کے زوال اور ان کی محکومی و ذلت کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا۔ لیکن آج یہ وبا جتنی اس برصغیر میں ہے اور کسی مسلمان ملک یا آبادی میں نہیں۔ دوسرے مسلمان ملکوں میں اور بہت سے جھگڑے ہیں اور وہاں کی سیاسی اتھل پتھل کی خبریں برابر آتی ہی رہتی ہیں، لیکن خوش قسمتی سے فقہی مذاہب اور دینی مذاہب کے باہمی اختلافات کا زور شور جو صدیوں تک ان ملکوں میں بڑا عام رہا، اب تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ مثال کے طور پر دنیائے اسلام کی قدیم ترین دینی درس گاہ مصر کی جامعہ ازہر کو لیجئے۔ ایک زمانے تک اہل السنت والجماعت کے آپس کے فقہی اختلافات کا یہاں بڑا چرچا رہا، لیکن

اب کچھ عرصے سے نہ صرف یہ کہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ کو ایک مشترک فقہ میں بدلنے کی سعی کی جارہی ہے بلکہ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ ازہر کے نصاب میں زیدی، جعفری اور اباضی (خارجی) فقہ بھی داخل کی گئی ہے۔

شروع میں یعنی فاطمی دَور میں، جب کہ جامعۂ ازہر کی بنا پڑی، اس زمانے کے تمام علوم وہاں پڑھائے جاتے تھے۔ بعد میں یہ درس گاہ خاص دینی علوم کے لئے یعنی جنہیں اُس وقت دینی سمجھا جاتا تھا مختص ہوگئی اور آخر میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب انیسویں صدی کے اواخر میں شیخ محمد عبدہ نے ازہر میں جغرافیہ پڑھانے کی تجویز کی تو علماءِ ازہر نے اس کی سخت مخالفت کی۔ دین اور دنیا کی دوئی اور پھر دین کو ایک خاص مکتب فقہ کا مترادف بنالینا یہ تھا آخری نقطہ جہاں اسلامی دنیا کی یہ سب سے قدیم و عظیم درس گاہ پہنچ گئی۔ لیکن اب نئے سرے سے جامعۂ ازہر میں جدید علوم کی تعلیم شروع کر دی گئی ہے۔ اور کوشش یہ ہے کہ ازہر سے جو بھی عالم دین فارغ التحصیل ہو، وہ عالمِ دین کے ساتھ ساتھ مصر کے ایک وزیر کے الفاظ میں، جس کے پاس اوقاف اور ازہر کا شعبہ ہے، ڈاکٹر ہو یا انجینئر ہو، ماہر زراعت ہو، یا اکونٹس اور حساب جانتا ہو تاکہ وہ دینی خدمت کے ساتھ معاشرے کی اجتماعی خدمت بھی کر سکے، جیساکہ اکثر مسیحی مشنری کرتے ہیں۔ اس سے ایک تو علماء جیساکہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، معاشرہ پر بار نہیں ہوں گے۔ دوسرے ان کا مقام لوگوں میں بلند ہو جائے گا۔ وہ ان کے ارشادات زیادہ توجہ سے سنیں گے اور انہیں اپنے دل میں جگہ دیں گے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دینی علوم کے ساتھ اس طرح اجتماعی و سماجی اور سائنسی علوم پڑھنے سے ان علماء کی نظر وسیع ہوگی۔ وہ نئی دنیا سے واقف ہوں گے اور دین اور دنیا کا صحیح اجتماع اور اسلام کا ان ہر دو کے لئے ہدایت ہونا عملاً ممکن ہو سکے گا۔

جامعۂ ازہر میں تعلیم کا یہ لائحہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ میٹرک کی تعلیم کے بعد طالب علم مختلف کلیات (کالجوں) میں بٹ جاتے ہیں۔ اور اپنے اپنے فطری رجحان کے مطابق ازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

جب تک ہمارے ہاں اولاً دینی تعلیم کا نظام فرقہ وارانہ بنیادوں پر قائم رہتا ہے اور ہر فرقے کے الگ الگ دینی مدارس ہیں۔ ثانیاً دینی تعلیم خاص مضامین پڑھانے تک محدود رہتی ہے۔ ثالثاً دینی تعلیم کے ساتھ دوسرے علوم اور بالخصوص جدید علوم شامل نصاب نہیں کئے جاتے۔ اور رابعاً ایسی درس گاہیں قائم نہیں ہوتیں جہاں تمام مکاتب خیال کے دینی طالب علم تعلیم حاصل کریں، اس سرزمین سے وہ مصیبت ختم نہیں ہوگی جس کی دردناک تصویر مولانا عبدالماجد صاحب نے کھینچی ہے۔

ہم فرقوں کے وجود کے خلاف نہیں۔ یہ ہماری ملّت کے تاریخی مظاہر ہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ انہیں ایک

اصل کی مختلف فروع سمجھا جائے۔ ان میں آپس میں تعاون ہو۔ اور یہ کثرت کثرت رہتے ہوئے ایک وحدت ہو۔ یہ ممکن ہے اور بعض اسلامی ملکوں میں علمی طور پر اسے عمل میں لایا جا رہا ہے۔

حال ہی میں مصر میں فقہ کی ایک انسائیکلو پیڈیا تیار ہو رہی ہے، جس کی دو ابتدائی جلدیں دیکھنے کا ہمیں اتفاق ہوا ہے۔ اس میں تمام مکاتب فقہ۔ اہل السنت والجماعت کی چار فقہوں کے ساتھ ساتھ زیدی، جعفری اور اباضی (خارجی) فقہ کو ایک درجہ دیا جا رہا ہے، اور ان میں سے جس کے ہاں مرتبین کے نزدیک زمانہ حاضر کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا کوئی فتویٰ ملتا ہے، اسے اس موسوعہ میں ضبط کیا جا رہا ہے۔ یہ کوشش اگر فقہ میں ہو سکتی ہے تو دوسرے مسائل میں بھی اس طرح کے نقاطِ اشتراک ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔

اور یہ زمانہ تو یوں بھی بقائے باہمی کا ہے۔ مسلمان فرقے آخر اسے کیوں نہ اپنائیں۔

اور پاکستان میں تو مسلمان فرقوں کے اس طرح کے بقائے باہمی کی اور بھی شدید ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ ملک اسلام کے نام سے بنا۔ عوام کا جذبۂ اسلامیت ہی اس کو وجود میں لانے کا محرک تھا۔ اب اسلام ہی اس کی قومیت کی اساس ہے۔ اور وہی اس کی جذباتی اور فکری وحدت کا ضامن ہے۔ اب خدانخواستہ اگر اسلام ہی موجودہ متحارب و متخاصم فرقوں کی شکل میں اس ملک کے عوام میں افتراق و انشقاق کا موجب بنتا ہے۔ اور وحدتِ ملت فرقہ واریت کی نذر ہو جاتی ہے، تو یہ صورت حال ہماری سالمیت کے کس قدر خطرناک ہے، اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

تقریباً تمام مسلمان ملک طویل دورِ زوال میں پیدا ہونے والے ان فرقہ وارانہ تفرقوں سے نجات پا چکے ہیں اور وہاں یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ ان تاریخی فرقوں کو ملت کے مختلف مکاتب خیال مان کر ان کے ہاں جو بھی اچھی چیز ملے، اسے پوری ملت کا ورثہ سمجھا جائے، اور اسے اپنا لیا جائے۔ اس طرح ہمارے ہاں وسعت فکر بھی ممکن ہو سکے گی اور مختلف فرقوں کے درمیان علمی و عملی اشتراک و تعاون کی راہیں بھی نکل آئیں گی۔ اتحاد بین الفرق کی یہی صورت ممکن ہے۔ فرقے صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ اور ان کا وجود میں آنا اور صدیوں تک زندہ رہنا اس امر کا بین ثبوت ہے کہ کچھ تاریخی تقاضے تھے، جو انہیں معرض وجود میں لانے کا سبب بنے۔ اب ان فرقوں کے وجود اور ان کی تاریخی افادیت کو تسلیم کئے بغیر ان کو ایک دوسرے کے قریب لانا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر جدید فقہ کی تدوین میں تمام تاریخی فرقوں کی فقہوں سے مدد لی جا رہی ہے۔ اسی طرح جدید علم کلام کی ترتیب میں ان سے بہت کچھ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

جب تک ملت میں قوتِ حیات رہی اور اس کی اخذ کرنے، ہم آہنگ بنانے اور نئے حالات سے عہدہ برآ

ہو کر آگے بڑھنے کی صلاحیتیں ختم نہیں ہوگئیں۔ ملت کے سواد اعظم کا یہی معمول رہا۔ شروع میں معتزلہ، پھر صوفیہ، اس کے بعد کتنے فرقوں کے اثرات و خیالات سواد اعظم نے قبول کئے اور انہیں ہم آہنگ بنا کر اپنے عقیدے میں شامل کر لیا۔ سواد اعظم اسی لئے سواد اعظم رہا کہ اس کا فکری سرمایہ ہر مسلمان فرقے کی کاوشوں سے استفادہ کرتا رہا اور اس میں اس نے اپنے عہد اقبال میں کبھی بخل نہیں کیا۔

روزنامہ "ڈان" کے نامہ نگار مقیم لندن نے لکھا ہے کہ اس دفعہ دنیا کے مسلمان ملکوں نے جو تین مختلف دنوں میں عید الفطر منائی ہے، اس کا برطانوی اخبارات نے خوب مذاق اڑایا ہے۔ ان اخبارات نے جہاں امریکی ہوابازوں کی کامیابی کا بڑی مسرت سے ذکر کیا، وہاں یہ بھی بتایا کہ مسلمان اب تک چاند دیکھنے کا کوئی ایک طریقہ نہیں طے کر سکے۔ چنانچہ برطانیہ کے مسلمانوں نے ایک دن عید نہیں منائی۔ چونکہ اکثر عرب ملکوں میں جمعہ کو عید تھی اس لئے وہاں جمعہ کو بھی عید ہوئی اور ہفتے کو بھی۔

اس دفعہ پاکستان میں گو عمومی طور پر آیت وار ہی کو عید ہوئی، لیکن بعض مقامات میں کچھ لوگوں نے اس بنا پر کہ جمعہ کی شام کو شوال کا چاند نظر آگیا تھا، ہفتے کو عید کرنا مناسب سمجھا۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ اس دفعہ کسی قسم کی بدمزگی نہیں ہوئی۔

ایک زمانہ تھا کہ ایک بستی دوسری بستی سے تقریباً کٹی ہوتی تھی۔ اور ایک کی خبر دوسری تک دنوں بعد پہنچ پاتی تھی۔ لیکن آج یہ حال ہے کہ ایک خبر چند منٹوں میں پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ اور پھر مختلف ملکوں کے مسلمان دوسری جگہوں میں جیسا کہ یورپ و امریکہ ہے، مل جل کر رہتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تمام مسلمان عیدین کے دنوں کے تعین کا کوئی ایسا طریقہ نکالیں کہ ہماری دوسری قوموں میں یوں جگ ہنسائی نہ ہو۔

آخر حج جو اسلام کا ایک رکن ہے، سعودی عرب میں جو چاند کا حساب ہے، اسی کے مطابق ہی ادا کیا جاتا ہے اور جن ملکوں کے حساب سے اس دن حج نہیں ہوتا، وہ بھی اس پر معترض نہیں ہوتے۔ کیا اسی طرح عید الفطر کے لئے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے چاند کے حساب کو معیار نہیں بنایا جا سکتا۔